حکیم محمود احمد ظفر

مقالۂ خصوصی

قسط اوّل

جمہوریت ایک فتنہ اور فراڈ

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس کی بنیاد اسلام کے نظریہ پر رکھی گئی ہے۔ اسلام کے نظریہ ہی کی خاطر ہندوستان کے ان صوبوں اور اضلاع کے لوگوں نے بھی پاکستان کے حق میں ووٹ دئیے تھے جن کو پورا یقین تھا کہ ہمارا صوبہ یا ضلع پاکستان میں نہیں آئے گا۔ اس نظریہ پاکستان کی خاطر ہی قریباً دس لاکھ انسانوں نے اپنی جانیں قربان کیں اور ہزارہا عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں۔ لوگوں کے گھربار برد باد ہوئے۔ فصلیں تاراج ہوئیں۔ یہاں تک کہ کئی کروڑ انسان اپنی جنم بھومیوں کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر پاکستان میں ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن نہایت افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان بننے کے بعد اقتدار پر ایک ایسا طبقہ قابض ہو گیا جن کی اپنی زندگیوں میں اگر خوردبین لگا کر بھی دیکھا جاتا تو شاید ہی اسلام کا کوئی جرثومہ نظر آتا۔ ان لوگوں کا اوڑھنا بچھونا مغربیت تھی اور مغرب کی ہر شے انھیں اسلام کے مقابلہ میں اچھی لگتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے پاکستان میں لوگوں کے مطالبہ کے باوجود اسلام کو نافذ نہ کیا البتہ مغربیت کی بنیادوں کو مضبوط کرتے رہے اور نئی نسل کے دلوں سے اسلامی اقدار کو نہ صرف نکالتے رہے بلکہ ان کی عزت و حرمت کو بھی ختم کرتے رہے یہی خدشہ قیام پاکستان سے قبل ان لوگوں نے ظاہر کیا تھا جنھوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی کیونکہ ان کی چشم بصیرت یہ دیکھ رہی تھی کہ پاکستان بننے کے بعد جو طبقہ مسند اقتدار پر قابض ہو گا وہ پاکستان میں کبھی بھی اسلام کو نافذ نہیں کرے گا اور نہ نافذ ہونے دے گا، اس لئے کہ ان کی اپنی زندگیاں اسلام سے یک قلم عاری ہیں۔

چنانچہ پاکستان بننے کے بعد اس مغرب زدہ طبقہ نے پاکستان میں جہاں مغرب کی اور چیزوں کو نافذ کیا وہاں طریقہ انتخاب بھی مغربی جمہوریت کو جاری کیا اور دلیل یہ دی کہ چونکہ پاکستان اس طریقۂ انتخاب سے قائم ہوا ہے، لہٰذا پاکستان قائم بھی اسی طریقہ انتخاب سے رہ سکتا ہے۔ حالانکہ یہ دلیل اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتی۔ پھر ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اس طریقہ انتخاب کی اس قدر تشہیر کی گئی کہ علماء کی ایک معتد بہ جماعت ان لوگوں کی ہمنوا بن گئی۔ پھر ان جمہوری علماء نے جمہوریت پر اسلام کا لیبل لگا کر اس کو اسلامی جمہوریت کا نام دے دیا، جس طرح دوسری جنگ عظیم کے بعد جب اشتراکی نظریات کو بہت زیادہ فروغ ہوا تو کچھ لوگوں نے جن میں کئی علماء بھی شامل تھے، یہ سمجھا کہ اسلام کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کو اشتراکیت کے مطابق ثابت کیا جائے، چنانچہ اسی زمانہ میں اسلامی سوشلزم کی اصطلاح وضع ہوئی، حتیٰ کہ کہا گیا کہ تاریخ کے سب سے بڑے اشتراکی (معاذاللہ) حضرت محمد ﷺ تھے۔

جمہوریت کو اسلامی برانڈ بنانے کے لئے ہمارے بعض علماء اور صحافی حضرات اور سیاست دانوں نے

قرآن و حدیث میں مشورہ کے بارہ میں جس قدر آیات اور احادیث تھیں۔ ان کو جمہوریت پر چسپاں کرنا شروع کر دیا، حالانکہ اسلامی مشورہ کو موجودہ جمہوریت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

وقت کے اسلوب میں دین کو بیان کرنا جتنا ضروری ہے، وقت کے فکر میں دین کو ڈھالنا اتنا ہی غلطی ہے۔ پہلی چیز تجدید دین ہے اور دوسری تحریف دین، اسلامی جمہوریت ثانی الذکر چیز ہے، لہذا جو شخص بھی اسلامی جمہوریت کی اصطلاح استعمال کرتا ہے وہ تحریف دین کا مرتکب ہو رہا ہے۔

یہ مغربی جمہوری نظام جس کو پاکستان جیسی نظریاتی اسٹیٹ میں نافذ کیا گیا ہے، سراسر غیر اسلامی اور غیر فطری ہے۔ یہ دراصل مغرب زدہ ذہن کی اسلام اور پاکستان کے خلاف ایک سازش ہے، کیونکہ پاکستان جو اسلامی نظریہ کی بنیاد پر بنا ہے، اس جمہوریت کے ذریعہ اس کے بنیادی نظریہ کو کسی وقت بھی ملک بدر کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ پاکستان کی پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت جب بھی چاہے، پاکستان کے دستور میں ترمیم کر کے اس کو اس ملک کے دستور سے نکال سکتی ہے۔ اور جیسا کہ ہماری نوجوان نسل کو قیام پاکستان سے لے کر اب تک دین سے دور اور مغربیت سے قریب حکومتی سطح پر کیا جا رہا ہے۔ اگر مزید چند سالوں تک یہی حال رہا تو پاکستان کے دستور سے اسلام کو نکالنا کوئی مشکل کام نہیں ہو گا۔ جو لوگ اسلامی سزاؤں کو "وحشیانہ سزائیں" شریعت اسلامیہ کو مُلّا ازم اور علمائے اسلام کو رجعت پسند طبقہ کہہ سکتے ہیں۔ ان سے یہ بھی بعید نہیں کہ وہ کل کو اسلام کو اپنی نام نہاد ترقی کے راستہ میں ایک روڑا سمجھ کر اس کو اپنے راستہ سے ہٹانے کی کوشش کریں۔

جمہوریت زدہ لوگ دراصل عوام کو ایک مغالطہ دیتے ہیں کہ مطلق العنان شخصی حکومت جس کو آجکل کی اصطلاح میں ڈکٹیٹر شپ یا آمریت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کے مقابلہ میں جمہوریت میں عوام کو آزادیٔ رائے ہوتی ہے۔ وہ اپنی بات برملا اور برسرعام کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے یہ نظام سربراہ مملکت پر ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے کہ وہ آمر یا مطلق العنان ڈکٹیٹر نہیں بن سکتا، لہذا یہ نظام نہایت اعلی اور اچھا ہے۔ حالانکہ یہ صرف ایک مغالطہ ہے حقیقت یہ نہیں ہے۔ جمہوری نظام حکومت کے پیچھے سوشلزم کی طرح ایک مستقل فلسفہ ہے۔ جو دین اسلام کے ساتھ ایک قدم نہیں چل سکتا۔ اور جس کے لئے سیکولرزم (Secularism) یا دوسرے لفظوں میں کفر پر ایمان لانا ضروری ہے، کیونکہ جمہوریت کا رکنِ اعظم اور بنیادی ستون عوام کی حاکمیت ہے جس کا مطلب یہ ہے، کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ عوام کا ہر فیصلہ جو کثرت رائے سے ہو ناقابلِ تنسیخ اور واجب العمل ہے۔ اور یہی شی اسلام میں کفر ہے، کیونکہ اسلام میں طاقت کا سرچشمہ عوام نہیں بلکہ اللہ تعالی کی ذات ہے۔ حاکمِ اعلی عوام نہیں بلکہ اللہ تعالی ہے۔ حاکمیتِ جمہور کا مطلب یہ ہے کہ ایک قوم کے عوام اپنی خواہشات اور اپنی آراء میں ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ وہ جس شی کو چاہیں، کثرت آراء سے اپنے لئے حلال یا حرام ٹھہرا سکتے ہیں۔ مذہب و اخلاق کا ضابطہ اور قانون ان کے فیصلے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ کسی ریاست کی اصل قوت کا انحصار وہاں کے عوام پر

ہوتا ہے، لہذا اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا کہ حاکمیت بھی انہیں کی ہونی چاہیئے۔ اس فلسفہ کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ اس نے حاکم اور محکوم کی دوئی کو یک قلم ختم کر دیا۔ اب حاکم بھی عوام ہیں اور محکوم بھی۔ یہ نظریہ بظاہر تو بڑا معقول نظر آتا ہے لیکن اس میں کئی مغالطے پوشیدہ ہیں۔ عوام جب اپنی خواہشات اور آراء میں ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں اور عوام ہی حاکم اور عوام ہی محکوم ہیں تو جو عوام حاکم ہیں وہ بھی ہر قسم کی پابندیوںؐ سے آزاد ہوں گے۔ اور ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔

اس فلسفہ کی اصل اساس یہ ہے کہ عوام کی مرضی ہی اصل حاکم ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کی مرضی کس طرح معلوم کی جائے۔ یہ بذات خود ایک بہت مشکل شی ہے۔ جیسا کہ آئندہ سطور میں بیان کیا جائے گا۔ دوسری بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ عوام جن کو حاکمیت کا اختیار دیا گیا ہے، ان کی اکثریت اکثر جاہل اور بیوقوف ہوتی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے محققین نے اس کو تسلیم کیا ہے، لہذا جمہوریت کے اس اصول کے تحت جمہوریت ایک ایسا نظام حکومت ہے جس میں جہلاء اور حمقاء کی اکثریت علماء اور عقلاء کی اقلیت پر حکمرانی کرتی ہے۔ چنانچہ مشہور ماہر سیاسیات برکے (Burke) نے ماہرین سیاست کی اس بارہ میں رائے یوں نقل کی ہے کہ:

"جمہوریتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ شرائط شاذ و نادر ہی پوری ہوئی ہیں۔ عملی اعتبار سے جمہوریت دراصل جہالت کی حکمرانی کا نام ہے، کیونکہ اس کی ساری توجہ کمیت اور تعداد پر رہتی ہے، کیفیت پر نہیں رہتی (یعنی بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا) اس میں ووٹ گنے جاتے ہیں انھیں تولا نہیں جاتا۔ شہریوں کی بہت بڑی تعداد اب بھی حکومت کو اپنے بنیادی وظائف زندگی میں سے نہیں سمجھتی۔ چنانچہ ان کو حکومت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتی ہے۔ اور اپنے پیشہ وارانہ اور فنی کاموں کو سرانجام دیتی رہتی ہے۔ ہل چلاتی، بیج بوتی، فصلیں کاٹتی اور ان کی خرید و فروخت میں مصروف رہتی ہے۔ انھیں یاد ہی نہیں ہوتا کہ وہ ملک کی حاکم ہے۔"

(Burke, the substance of politics, P.133)

اسی وجہ سے ماہرین سیاست نے جاہل اکثریت کی بجائے عاقل اور عالم اقلیت کو حکومت کا مستحق قرار دیا ہے، کیونکہ حکومت عقل سے چلتی ہے جہالت سے نہیں۔ چنانچہ روسو نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے۔

"حکومت کا بہترین اور سب سے فطری انتظام یہ ہے کہ عقل مند ترین انسان کو کثرت پر حکومت کرنی چاہیئے بشرطیکہ اس بات کی ضمانت مل جائے کہ وہ اس کثرت کے مفاد کے لئے حکومت کرے گا نہ کہ اپنے مفاد کے لئے۔" (Burke, the substance of Politic, P.127)

اور ٹامس کارلائل Thomas Carlyle نے تو اور بھی واضح اور صاف الفاظ میں اس بات کو یوں کہا ہے:

"کسی بھی ملک میں وہاں کے قابل ترین آدمی کو دریافت کر لو۔ پھر اسے اٹھا کر اطاعت و اقتدار کے عالی ترین مقام پر رکھ دو اور اس کی اطاعت بجا لاؤ۔ اس طرح تم اس ملک کے لئے ایک مکمل حکومت دریافت کر لو گے۔ پھر بیلٹ پیپر، بیلٹ بکس یا پارلیمنٹ میں ہونے والی فصاحت و بلاغت یا رائے شماری یا دستور سازی یا کسی بھی قسم کی کوئی اور مشینری اس حکومت میں کوئی اور بہتر اضافہ نہیں کر سکے گی۔ یہ ایک مکمل ریاست ہو گی اور وہ ملک ایک مثالی ملک ہو گا۔"

(G.N. Salive, A History of Political theory, P. 764)

اس سے پتہ چلا کہ جمہوریت نہ صرف خلاف اسلام اور خلاف فطرت نظام حکومت ہے بلکہ عوامی حاکمیت کا تصور جو جمہوریت کا ایک بنیادی ستون ہے۔ محض ایک سراب ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔
اسی وجہ سے الفرڈ کابن (Alfred cobbon) نے بالکل درست کہا ہے:

"جمہوریت ایک خیالی محبوبہ ہے جو اگرچہ کنواری ہے لیکن بانجھ بھی ہے۔"

(Alfred cobbon, the crisis of civilization, P.21)

گذشتہ ۴۳ سال میں بعض سیاسی جماعتیں (اور اب ایک جماعت تو بڑے زور شور کے ساتھ) ملک میں جمہوری نظام حکومت کے قیام کا پرچار کر رہی ہیں حالانکہ اندرون جماعت ان کی اپنی پالیسی سراسر غیر جمہوری ہے۔ (کسی جماعت پر کسی خاندان کی اجارہ داری ہے تو کسی پر کسی خاص شخصیت کی) چنانچہ ان جماعتوں کے اندر نہ کبھی الیکشن اور نہ کسی کو اختلاف کے اظہار کا حق ہے۔ حالانکہ یہی چیزیں جمہوریت کے بنیادی ستون ہیں۔ جب کبھی ان کی اپنی جماعت میں سے کسی نے اختلاف رائے کیا تو یا تو اس کو ذلیل و رسوا کیا گیا یا پھر کسی غلط طریقے سے اس کو راستہ سے ہٹا دیا گیا۔ اور اگر اس اختلاف کرنے والے نے جرات کا اظہار کر کے یا جماعت کے سربراہ کی مخالفت کو خیر باد کہہ دیا تو اس شریف انسان نے اپنی توہین سمجھی کہ وہ کسی دوسری جماعت میں شامل ہو کر ملک و ملت کے لئے کام کرے بلکہ اس نے اپنی الگ سیاسی جماعت بنالی خواہ اس کا کوئی ممبر ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ پاکستان میں بعض سیاسی جماعتیں ایسی ہیں جن کے کل ممبران ایک ٹانگے پر سوار ہو سکتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا کہ ان بے شمار سیاسی جماعتوں کا مملکت کے نظام حکومت کے بارہ میں کیا نظریہ ہے؟ کیا یہ سب جمہوریت چاہتی ہیں یا کچھ جماعتیں جمہوریت کے علاوہ کوئی اور نظام حکومت چاہتی ہیں۔ اگر سب جمہوریت ہی چاہتی ہیں تو یہ سب آپس میں مدغم ہو کر ایک جماعت کیوں نہیں بن جاتیں تاکہ جمہوریت کو فروغ ہو کیونکہ ملک میں جتنی کم سیاسی پارٹیاں ہوں گی جمہوریت کو اتنا ہی فروغ حاصل ہو گا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت کا روز و شب پرچار کرنے والی یہ سیاسی پارٹیاں خود جمہوریت کے بارہ میں مخلص نہیں ہیں، وہ اسلام کے بارہ میں کیا مخلص ہوں گی۔

تو بنویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری

بخدا کہ واجب آمدز تو احتراز کردن

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ یہ اسلام کے نظریہ کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی اور اسلام کے نظریہ ہی پر قائم رہے گی۔ مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان سے الگ ہو جانا بھی اسی وجہ سے تھا کہ اتنی دور کے دو حصوں کو آپس میں متحد رکھنے والی قوت اسلام کو انہی سیاسی جماعتوں نے کمزور کر دیا تھا جس کی وجہ سے ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان نے مغربی بازو سے الگ ہو کر بنگلہ دیش کی شکل اختیار کر لی۔ اور پاکستان جس کو اتنی قربانیاں دے کر حاصل کیا گیا تھا، آدھا ہو کر رہ گیا۔

ایک نظریاتی مملکت کا نظریہ اس مملکت کے لئے بمنزلہ ایک ستون کے ہوتا ہے۔ اس نظریہ کا کمزور ہو جانا یا ختم ہو جانا مملکت کے زوال اور تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ لہذا جب تک اسلامی نظریے کو ہر شعبہ زندگی میں پنپنے نہیں دیا جائے گا، مملکت کبھی بھی پختگی اور مضبوطی کے مراحل طے نہیں کر سکتی۔ چنانچہ پاکستان میں سوائے اسلام کے اور کوئی نظامِ حکومت نہیں چل سکتا جو مملکت کی مضبوطی (Stability) کا ضامن ہو۔ جمہوریت اور سوشلزم کے لئے اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ سوشلزم کی آواز تو اب ذرا مدھم ہو گئی ہے۔ لیکن اب ہر سیاسی جماعت کی زبان پر جمہوریت کا نعرہ ہے اور اس نعرہ سے وہ عوام کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ جمہوریت کا یہ نعرہ نظریہ پاکستان کے سراسر منافی ہے کیونکہ جمہوریت اسلام کے ساتھ لگا نہیں کھا سکتی۔ اور نہ ہی اسلام جمہوریت کا حامی ہے۔ گویا نہ اسلام میں جمہوریت ہے اور نہ جمہوریت سے ملک میں اسلام آسکتا ہے۔ اسلام جمہوریت کا سخت مخالف ہے اور اسلامی جمہوریت اسلام کی کوئی اصطلاح نہیں ہے۔ اور اگر اسلامی جمہوریت کی اصطلاح صحیح ہے تو پھر اسلامی سوشلزم اور اسلامی کمیونزم کی اصطلاحیں بھی درست ہیں کیونکہ اگر جمہوریت اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر اسلامی ہو سکتی ہے تو سوشلزم اور کمیونزم میں بھی بعض چیزیں اسلام کے ساتھ مشترک ہیں۔

جمہوریت کے خلاف اسلام ہونے کا سن کر بعض حضرات چونک پڑتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ قیام پاکستان سے لے کر ہم اکثر سیاسی پارٹیوں سے جمہوریت ہی کا نام سن رہے ہیں۔ جن میں ہم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ اسلام جس کی بنیاد پر ہم نے یہ ملک بنایا تھا وہ اس نظام حکومت کو قبول بھی کرتا ہے یا نہیں؟ اس کے خلاف اسلام ہونے کے بارہ میں اس سے قبل کئی مفکرین اسلام نے لکھا جن میں علامہ اقبال، سید ابوالاعلیٰ مودودی (معلوم نہیں قیام پاکستان کے بعد انہوں نے اپنے اس فتویٰ سے کیوں رجوع فرما لیا تھا کیونکہ انہوں نے صرف اسی وجہ سے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی کہ وہاں جمہوری نظام حکومت ہو گا۔ ملاحظہ ہو سیاسی کشمکش جلد ۳ ص ۱۲۶، ۱۷۳) حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا مفتی محمد شفیع خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہم ان سب دلائل کو یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں جن سے ثابت ہوتا

ہے کہ جمہوریت نہ صرف خلافِ اسلام ہے بلکہ خلافِ فطرت بھی ہے۔

۱۔ جمہوریت کے خلاف اسلام ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جمہوریت میں حاکمیتِ اعلیٰ (Sovereignty) جمہور اور عوام کی ہوتی ہے جب کہ اسلامی نظام حکومت میں حاکمیتِ اعلیٰ صرف اور صرف اللہ رب العزت کی ہوتی ہے گویا جمہوریت میں عوام اللہ عزوجل کے مقابل کی شی ٹھیرتے ہیں۔

علم سیاست میں حاکمیت کا لفظ اقتدار اعلیٰ اور اقتدار مطلق کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جمہور کے صاحب حاکمیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا حکم قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور انہیں افراد سیاست پر حکم چلنے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہیں اور افراد ان کی غیر مشروط اطاعت پر مجبور ہیں۔ افراد کو ان کے مقابلہ میں کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ جس کے جو بھی حقوق ہیں وہ انہی کے عطاء کردہ ہیں وہ ہر حق کو سلب کرنے کا بھی کلی اختیار رکھتے ہیں۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ قانون صاحب حاکمیت کے ارادے سے وجود میں آتا ہے اور افراد کو اطاعت کا پابند بناتا ہے۔

انسانی سوسائٹی میں اگر تلاش و جستجو کی جائے تو کوئی قامت ایسا نہیں ملتا جس پر حاکمیت کا یہ جامہ راست آتا ہو۔ اس کا اطلاق صرف اور صرف

"فَعَّالٌ لِمَا يُرِيد"

پر ہوتا ہے جس کا حکم قانون، جس کی طاقت اور قوت لامحدود، جس کے کام غیر مسئول اور جس کی ذات منزہ عن الخطاء ہو اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس ہے علامہ اقبال مرحوم نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو ایک میں یوں بیان کیا ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

ایک مومن صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا حاکم حقیقی سمجھتا ہے اور اللہ کے سوا باقی سب کو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے مقابلہ میں بتان آذری تصور کرتا ہے۔ مومن کے سوا تمام لوگ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں حاکموں کے محکوم ہیں۔ اگرچہ وہ دنیا میں بغیر کسی زنجیر اور بیڑی کے آئے تھے لیکن دنیا نے ان کے پاؤں میں حاکمیت کی بہت سی بیڑیاں ڈال دیں، لیکن ایک مرد مومن صرف ایک ہی ذات کا محکوم ہے اور وہ ایک ہی حاکم کا حکم مانتا ہے۔ کیونکہ اسے کہا گیا ہے ان الحکم الا للہ (حکم صرف اللہ ہی کا ہے) وہ ماں باپ، استاد و مرشد اور امراء اور بادشاہوں کا حکم اگر مانتا ہے تو اس لئے کہ احکم الحاکمین نے ان کے ایسے حکموں کے ماننے سے نہیں روکا جو اس کے حکموں کے خلاف نہ ہوں گویا کہ (باقی آئندہ)